© rasailojaraid.com

علمائے ہند کا سیاسی موقف

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی ایم - اے

انگریزوں کی حکومت قایم ہو جانے کے بعد علمائے کرام نے ملک کے حالات کا جائزہ دیدہ وری اور وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ لیا تو انہیں یہ بات صاف طور پر محسوس ہوئی کہ مسلمانوں کی شامت اعمال نے انگریزوں کے روپ میں ان پر ایک نادر مسلط کر دیا ہے "قرآن کے اعلان کے مطابق مسلمانوں کو "قوامون بالقسط" یعنی دنیا میں عدل وانصاف قایم کرنے والے ہونا چاہئے کہ وہ ظلم وجور سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے ساتھیوں - پروسیوں اور دوسرے انسانوں کو بھی بچائیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ مسلمان پہلے سچے اور پکے مسلمان ہوں علماء نے محسوس کیا کہ یہ سب مصیبتیں مسلمانوں پر اور ان کے واسطہ سے پورے ملک پر اس لئے آئی ہیں کہ مسلمان صرف نام کے مسلمان رہ گئے ورنہ ان کے فکر و نظر میں - اعمال وافعال میں اور اخلاق و کردار میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے یہ کہا جا سکے کہ یہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کسی بہترین نظام زندگی کے حامل ہیں - اس بنا پر علماء نے انحطاط و زوال کے اصل سبب کا کھوج لگا کر اپنی تمام کوششیں اس پر مرکوز کر دیں کہ مسلمانوں کو مسلمان بنایا جائے اور انہیں صحیح اسلامی فکر و ذہنیت کی تخم ریزی کر کے اس قابل بنایا جائے کہ وہ پھر اپنے منصب قوامونا بالقسط کو حاصل کر سکیں -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دار العلوم یہ علماء نہ سر سید کی طرح ملک کے سفید فام آقاؤں کی تلوار سے خوف زدہ ہوتے اور نہ ان کو ہندوؤں کی عددی اکثریت نے اس پر مجبور کیا کہ وہ اس کی زد سے بچنے کے لئے حکومت وقت کے دامانِ کرم میں پناہ ڈھونڈھتے۔ انھوں نے کمال خود اعتمادی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ مسلمانوں کی ذہنی اور دماغی تربیت کا کام شروع کر دیا اور اس مقصد کے لئے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا تلوار سے مقابلہ کیا تھا اپنے چند رفقاء کے ساتھ دار العلوم کے نام سے ۱۲۸۳ھ میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا۔

علماء اور علوم جدیدہ علماء کی نسبت عام اعتراض ہے کہ وہ وقت کے مصالح کا بالکل لحاظ نہیں کرتے اور اپنی خشک مذہبیت کی چہار دیواری سے باہر نکل کر یہ دیکھتے ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسی سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ جب سر سید نے مسلمانوں میں انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی اشاعت کرنی چاہی تو علماء نے مخالفت کی اور مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے باز رکھنے کی نامستحسن کوشش کی ممکن ہے کسی ایک عالم یا علماء کی کسی ایک جماعت کی نسبت یہ خیال صحیح ہو۔ لیکن جہاں تک مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء کا تعلق ہے یہ اعتراض قطعاً بے بنیاد ہے۔ مولانا نانوتوی کو سر سید سے جو اختلاف تھا وہ ان کے فساد عقائد کی وجہ سے تھا اور اس بنا پر تھا کہ وہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں ایک غلامانہ فکر۔ انگریزوں کی نقالی کا جذبہ اور دین سے بے اعتنائی کا میلان پیدا کر رہے تھے۔ ہر ایک سلیم الفکر مسلمان کی طرح مولانا اس کا یقین رکھتے تھے کہ سر سید کی روش مسلمانوں کے لئے دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے زہر ہلاہل ثابت ہوگی چنانچہ مولانا اپنے ایک ارادتمند پیرجی محمد عارف صاحب کو جو مولانا اور سر سید میں خط وکتابت کا وسیلہ تھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس وقت کی عرض ومعروض کا ماحصل فقط اتنا ہی تھا کہ سید صاحب (سر سید)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ہاں میں ہاں ملانا ہم سے جبھی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو ان کی نسبت پر کوئی گاتا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے" (تصفیۃ العقائد ص ۵)

مولانا سرسید کی دردمندی اہل اسلام کے بھی معترف تھے اسی مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں۔

"پیرجی صاحب! یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور الجھے بھی تو کیوں کر الجھے وہ کونسی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار رہوں ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل کو چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پھنسوں ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ ہوں" (تصفیۃ العقائد ص ۶)

سرسید تو پھر بھی مسلمان تھے اور مسلمانوں کا درد رکھتے تھے۔ علماء تو اس رحمت عالم پیغمبر کے نقش قدم پر چلتے ہیں جس نے دشمنوں سے پتھر کھا کے بھی ان کے حق میں دعاء خیر کی ہے اس بناء پر مولانا ذاتی طور پر سرسید سے کیونکر عناد رکھ سکتے تھے۔ اختلاف صرف ان کی غلط پالیسی اور غلط طریق کار سے تھا جو بے شبہ انگریزوں کی سیاست کا شکار ہو جانے کا نتیجہ تھا

سرسید کے ذاتی احترام و ادب اور ان کے ساتھ محبت کے علاوہ سرسید مسلمانوں کو جن علوم جدیدہ کی دعوت دے رہے تھے مولانا کو اس سے بھی اختلاف نہیں بلکہ وہ ان کے حامی اور موید تھے البتہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلمان علوم جدیدہ اس وقت سیکھیں اور پڑھیں جبکہ اُن کی ذہنی اور دماغی تربیت اسلامی طرز فکر (Ideology) کے مطابق ہو چکی ہو ورنہ اندیشہ تھا (اور یہ اندیشہ بعد میں ایک نہایت تلخ حقیقت بن کر جلد ہی سامنے بھی آگیا) کہ مسلمان گمراہ ہو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے دین اور دنیا دونوں کو برباد کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ قیام دارالعلوم کے آٹھ سال بعد پہلے جلسہ تقسیم اسناد و دستار بندی کے موقع پر مولانا نے جو تقریر کی تھی اس میں صاف صاف علوم جدید کی حمایت۔ نگران کی تحصیل کی شرط پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"اگر طلبائے مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موئید ہوگی کاش گورنمنٹ ہند بھی طلبار کے لئے داخلہ کی قید عمر کو اٹھا دے۔ تاکہ رفاہ عام رہے اور سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد کسے کہتے ہیں۔

(القاسم کا دارالعلوم نمبر ص ۶۷)

مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ کو جو شامل نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ ایک تو یہ بھی کہ انگریزی تعلیم کے سرکاری مدارس جگہ جگہ قایم تھے۔ ہر شخص ادن سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کس مپرسی کے عالم میں تھے تو یہی اسلامی علوم و فنون تھے جن کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا اسی خطبہ میں ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ بنانا تحصیل حاصل نظر آیا"

علاوہ بریں مولانا یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ علوم قدیمہ میں استعداد بہم پہنچانے کے بعد ایک طالبعلم کا دماغ علوم و فنون سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی تحصیل بڑی آسانی سے اور دوسرے بے استعداد طلباء کے مقابلہ میں زیادہ عمدگی اور خوبی و پختگی کے ساتھ کر سکتا ہے

چنانچہ فرماتے ہیں:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اور انشاء اللہ یہاں کے (دارالعلوم دیوبند) طالب علم بشرط تکمیل باقی علوم قدیمہ اور جدیدہ کو بوجہ قوت استعداد بسہولت بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے۔ فقط علوم دینیہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے ....

.... اس لئے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم و فنون جدیدہ سے کامیاب نہ ہوئے ہوں پر ان کے حق میں یہ ان کی استعداد مثل استاد کامل تعلیم کے لئے کافی ہوگی (القاسم کا دارالعلوم نمبر محرم الحرام ۴۷ھ)

ان اقتباسات سے یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقائے کرام جو بے شبہ اپنے زمانہ کے کبار علماء اور اساطین دیانت و تقویٰ تھے نہ انگریزی زبان سے بیر رکھتے تھے[1] نہ علوم جدیدہ سے نفور تھے اور نہ اتنے تنگ نظر اور متعصب تھے کہ انھیں وقت کے جدید تقاضوں کی خبر ہی نہ ہو سرسید کی طرح ملک کے نئے حالات۔ اور ان حالات کے نئے مطالبات کا ان کو بھی پورا علم تھا اور وہ انھیں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی سوسائٹی کی تعمیر ایک ایسے طریقہ پر کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان پکے اور سچے مسلمان بھی بن جائیں اور اپنے برادران وطن کے ساتھ انگریز کی اس غلامی سے بھی نجات پا جائیں جو بلائے بے درماں کی طرح ان پر مسلط ہو گئی تھی

دارالعلوم دیوبند کے اس ابتدائی دور میں سب سے زیادہ چرچا درس و تدریس مذہبی مباحثہ و مناظرہ اور روحانی افادہ و افاضہ کا سنا جاتا ہے اور سیاسی سرگرمی بہ ظاہر مفقود نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا۔ دارالعلوم کا یہ دور تعلیم و تربیت اور ذہنی و دماغی تثقیف کا دور ہے یہ ظاہر ہے کہ سپاہی ٹریننگ پانے والے ٹریننگ ختم ہونے سے پہلے جنگ پر نہیں بھیجے جاتے جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ

---

[1] یہاں اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا نانوتوی حج کے لیے جاتے ہوئے ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پرسکون وخاموش تربیت کا نتیجہ تحریک حضرت سید احمد شہید کی صورت میں انیسویں صدی میں ظاہر ہوا تھا ٹھیک اسی طرح مولانا نانوتوی۔ مولانا گنگوہی اور دوسرے اکابر کی تعلیم وتربیت (بواسطہ دارالعلوم) کا عملی وسیاسی اثر بیسویں صدی کے آغاز میں تحریک حضرت شیخ الہند اور بعد میں جمعیۃ العلماء کی صورت میں ظاہر ہوا یہی وجہ ہے کہ اگرچہ علمائے دیوبند نے اس وقت سیاسیات میں عملی حصہ نہیں لیا لیکن ان کا دماغ سیاسی فکر سے خالی نہیں تھا حکومت کی بار بار کوششوں کے باوجود مدرسہ کے لئے سرکاری امداد قبول نہ کرنا۔ گورنمنٹ کے ساتھ کوئی تعلق پیدا نہ کرنا۔ حضرت مولانا نانوتوی کی وصیت کے مطابق جواب بھی دارالعلوم کے خزانہ میں محفوظ ہے دارالعلوم کا خرچ زیادہ تر عام مسلمانوں کے چندہ سے ہی چلانا اور اس کے لئے امرا ورؤسا کے پاس نہ جانا۔ یہ سب کچھ علماء کی گوشہ نشینی اور عزلت پسندی کی وجہ سے نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اس طرز عمل کی بنیاد اس تخیل پر تھی کہ گورنمنٹ سے مالی مدد لینے کے بعد ان کی تعلیم بالکل آزاد نہیں رہ سکتی اور یہ حضرات چاہتے تھے آزاد تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی نسل پیدا کرنا جس کا دماغ اور ذہن سرکاری مدد کا کسی درجہ میں ممنون نہ ہو اور جو بہمہ جہت آزاد فکر کے ساتھ علم وعمل کی زندگی بھی بسر کر سکے۔

دارالعلوم دیوبند کی اس خاموش وپرسکون تعلیم وتربیت نے سیاسی اعتبار سے علماء میں کس قسم کی ذہنیت پیدا کی اور انھوں نے اس میدان میں کیا کیا اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے

(بقیہ صفحہ ۲۵) کہتے کہ جہاز کے انگریز کپتان نے مولانا کو اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگا کہ مولانا! آپ کی نماز کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بھی نماز پڑھتے دیکھا ہے مگر وہ تو اس طرح نہیں پڑھتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی اور خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے مسلمان کسی اور خدا کے لئے۔" مولانا انگریز کی بات سن کر جذبہ سے بیقرار ہو گئے سمجھانے کی کوشش کی مگر زبان کی مغایرت کی وجہ سے سمجھا نہ سکے اور بڑی حسرت سے فرمایا اے کاش میں انگریزی زبان میں تقریر کر سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دیوبند کی داستان کو یہاں پر ناتمام چھوڑ کر ہند کے ایک دوسرے طبقۂ علماء کا ذکر کیا جائے[1]

مولانا شبلی نعمانی اور ندوۃ العلماء علمائے ہند کا ایک دوسرا مرکزی ادارہ ندوۃ العلماء ہے جس کے روح رواں ملک کے نامور محقق و فاضل مولانا شبلی نعمانی تھے مولانا سرسید کے معاصر۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں ان کے دست راست اور رفیق کار تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علیگڈھ کی فضا میں علم وادب اور اسلامی و تاریخی لٹریچر کا مذاق پیدا کرنے میں مولانا کی علمیت و قابلیت اور ان کی کوششوں کا بہت بڑا دخل ہے جب تک سرسید علیگڈھ کے مشہور پرنسپل مسٹر بیک کے زیر اثر آکر سیاسی اعتبار سے "مرتد" نہیں ہوئے تھے مولانا علیگڈھ میں اطمینان سے کام کرتے رہے لیکن جب سرسید نے مختلف پارٹیوں کے نام سے اور انفرادی طور پر بھی مسلمانوں کی غلط سیاسی رہنمائی شروع کی تو مولانا کے لئے اس کو برداشت کرنا ناممکن ہوگیا دونوں میں آئے دن ان بن رہنے لگی اسٹیج اور اخبارات کے صفحات پر بھی اس کا اظہار ہونے لگا مولانا طبقۂ علماء سے تعلق رکھنے اور قدیم تعلیم یافتہ گروہ کے ایک قابل فخر فرزند ہونے کی وجہ سے نہ سیاست افرنگ کے ہمرنگ زمیں دام میں اسیر ہو سکے اور نہ سرسید کی ہمہ گیر شخصیت کا ان پر جادو چل سکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی زندگی تک جوں توں کر کے شیوۂ ارباب وفا نباہتے رہے ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ہی علیگڈھ کو خیرآباد کہہ ندوۃ العلماء کو سنبھال کر بیٹھ گئے مولانا کو سرسید سے جن امور میں اختلاف تھا مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو خوب منقح اور واضح کر کے حیات شبلی میں بیان کیا ہے اس

---

[1] ہم نے گذشتہ صفحات میں دیوبند اور علیگڈھ کا موازنہ کیا ہے لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ دیوبند اور علیگڈھ سے مراد صرف انھیں دونوں تعلیمی اداروں کے حضرات ہیں بلکہ دیوبند سے مراد قدیم تعلیم یافتہ گروہ ہے اور علیگڈھ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ؛ خواہ ان طبقوں کے افراد تعلیمی اعتبار سے ان اداروں سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو مذہبی۔ سیاسی اور معاشرتی امور علماء دیوبند اور سرسید گروپ میں اختلاف کا باعث تھے وہ ہی سرسید اور مولانا شبلی کے باہمی مناقشہ و مخالفت کا سبب تھے یہاں ہم مولانا شبلی کے سیاسی افکار بیان کریں گے تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ قدیم تعلیم کا کوئی ایک فرد علیگڈھ کی فضا میں رہتے ہوئے بھی انگریزوں کی سیاست سے غیر متاثر رہ کر ملکی سیاسیات میں کس نقطۂ نظر و طرز فکر کا حامل ہوتا تھا۔

مولانا نے اب سے کم و بیش نصف صدی قبل مسلمانوں کی فرقہ پرورانہ سیاست اور اس کی ذیل میں مسلم لیگ اور دوسری حکومت پرست جماعتوں کی مذمت و ہجو۔ اور اس کے بالمقابل کانگرس کی حمایت۔ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت اور ہندوستانی قومیت وغیرہ پر نثر اور نظم میں نہایت جوش و خروش سے جو مقالات لکھے ہیں انھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ایک نیشنلسٹ اور قوم پرور مسلمان بھی ان مسائل سے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہے جتنا کہ مولانا کہہ گذرے ہیں۔ سرسید گروپ کی فرقہ وارانہ سیاست کے بالمقابل مولانا شبلی کی یہ گرج ہماری سیاست قبل از جنگ عظیم اول کی کتاب کا ایک نہایت روشن اور اہم باب ہے اس لیئے ہم ذیل میں مولانا کے افکار خود ان کے الفاظ میں جستہ جستہ پیش کرتے ہیں۔

انگریزوں سے خوف زدگی کی مذمت | سرسید نے مسلمانوں کو انگریزوں سے جو حد درجہ خوف زدہ کر دیا تھا مولانا اس کی نسبت لکھتے ہیں۔

" ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی۔ اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پر زور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں . . . . اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست ہو گئی۔ جبن بزدلی چھا گئی۔ ہمارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے ایک پارسی یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندو کانگرس میں جاتا ہے۔ انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں یہاں تک کہ مرحوم کو علیگڈھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑا کہ تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لئے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے[1]

سرسید کے سیاسی ارتداد کا ماتم مسٹر بیک کے زیر اثر سرسید کی جو قلب ماہیت پیدا ہو گئی تھی مولانا نے اس کا نہایت پر درد مرثیہ لکھا۔ فرماتے ہیں

"اس عجیب اور حیرت انگیز اختلاف حالت کا سمجھنا آسان نہیں یہ حالت قدرتی اور اصلی نہ تھی بلکہ پر زور رکاوٹوں نے پیدا کی تھی وہ پر زور دست قلم جس نے "اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا کانگرس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پر زور لٹریچر پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ جان باز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہیں تھیں . . . . حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالٹیکس سے روک دیا۔ یہ کیوں

---

[1] مولانا کے سیاسی مضامین جو الندوہ اور مسلم گزٹ وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے مقالات شبلی کی جلد ہشتم میں یکجا کر دیئے گئے ہیں اس سلسلے کے سب۔۔ اقتباسات اسی مجموعہ کے مختلف مضامین سے ماخوذ ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔"

مسلم لیگ کی حقیقت | مسلم لیگ کا مذاق کس انداز میں اڑاتے ہیں؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا انیسویں صدی کے آغاز میں نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء میں اس کے سب آغاز و انجام دیکھ کر اس کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر رہے ہیں فرماتے ہیں:۔

"اس موقع پر پہنچ کر دفعۃً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے۔ مسلم لیگ" یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ انٹی کانگرس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے"

مسلم لیگ کی سیاست کا مرتبہ مولانا کی نظر میں کیا تھا! سطور ذیل سے اندازہ ہوگا!

"ہم پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم لیگ پر اعتراض کرتے ہیں لیکن خود نہیں بتاتے کہ صحیح پالیٹکس کیا ہے؟ اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے۔ یہی صحیح پالیٹکس ہے غلط پالیٹکس کے جراثیم قوم کے دل و دماغ میں سرایت کر گئے ہیں اور یہی جراثیم صحیح پالیٹکس کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔"

مسلم لیگ کا اصل مقصد | مسلم لیگ کا کارنامہ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے کہ اس نے ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا کر کے دونوں کو لڑایا مولانا کی نگاہ ژرف بیں نے اس حقیقت کو شروع ہی میں تاڑ لیا تھا۔ دیکھئے کس جزم و یقین سے لکھتے ہیں:۔

"آج مسلم لیگ گو شرم مٹانے کے لئے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اس کے چہرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مستعار غازہ ہے۔ رات دن جو شور مچایا جاتا ہے روزمرہ جس عقیدہ کی تعلیم دیجاتی ہے جو جذبہ ہمیشہ ابھارا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں اس لئے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہیئے۔ مسلم لیگ کا اصل عنصر صرف یہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے"

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کا ان کے کارناموں اور منظور شدہ تجاویز کی روشنی میں موازنہ کرکے بتایا ہے کہ لیگ صرف حکومت کے خوشامدیوں آرام طلب نوابوں۔ اور عشرت پرست رئیسوں کی انجمن ہے اور کانگرس ایک عملی جماعت ہے جس کی وجہ سے سلف گورنمنٹ کا قدم برابر آگے بڑھتا جاتا ہے"

اسی ذیل میں مخلوط انتخاب کی حمایت کی ہے اور مسلم لیگ کے مطالبہ جداگانہ انتخاب کا نہایت پرزور لفظوں میں مذاق اڑایا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد مسلم لیگ کی سیاست کے برخلاف مولانا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے ان کا یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ان غلط تاریخی واقعات پر محققانہ مقالات لکھے جن کی عام شہرت ہندو مسلمانوں میں تفرقہ کا باعث ہو سکتی تھی۔ مثلاً "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر"، "مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی" "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر" "بھاشا زبان اور مسلمان" ان علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ مولانا نے جو سیاسی مقالات لکھے ہیں ان میں بار بار اور جابجا ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا ہے اور لیگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جو بنانا چاہتی تھی اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے اس سلسلہ میں ہم مولانا کے ایک مقالہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں موصوف نے ایسی صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ گویا تاریخ کی عدالت میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا مقدمہ لڑ رہے ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اس سے ہمارے برادرانِ وطن کو اندازہ ہوگا کہ علمار فرنگی سیاست کے دام میں نہ پھنس سکے ان کے دل و دماغ کس قدر صاف۔ انصاف پسند اور محبت آشنا تھے اور وہ ملکی معاملات میں کس عالی ہمتی - بلند حوصلگی اور وسعت قلب و نظر سے کام لینے کے خوگر تھے۔" فرماتے ہیں

"مسائل پالیٹکس کا یہ ایک اہم مسئلہ قرار دے دیا گیا ہے یعنی چونکہ ان دونوں قوموں میں اتحاد ناممکن ہے اس لئے پولیٹکل معاملات میں ہمارا اور ہندوؤں کا کوئی ایک پلیٹ فارم نہیں بن سکتا"

اس دلیل کے اگرچہ دونوں ٹکڑے غلط ہیں لیکن اس فتنہ کو جس قدر کوئی بھڑکانا چاہے۔ بھڑکا سکتا ہے .... تاریخی ترتیب اور منطق کے استدلال تمثیل کے لحاظ سے ہم کو ہندوؤں کی پچھلی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے بظاہر ہے کہ ہندو کبھی ایران و عرب پر چڑھ کر نہیں گئے تھے۔ اس کے بجائے ان کے ملک پر خود ہم نے حملہ کیا ہم نے ان کا مشہور کعبہ" سومنات" برباد کر دیا ہم نے بنارس اور متھرا کے شوالے ویران کر دیئے [1]

"ہندوؤں کی خاندانی روایتیں ان زخموں کو ہمیشہ ہرا رکھتی ہیں لیکن جب اکبر نے ایک دفعہ محبت کی نگاہ اٹھاکر ان کی طرف دیکھ لیا تو یہی زخم خوردہ دل محبت سے چور تھے

---

[1] مولانا جتنے بڑے محقق اور فاضل تھے۔ اسی قدر جذباتی بھی تھے۔ ان سطور کی اشاعت کے بعد انھیں خیال آیا کہ شدت جذبات میں وہ ایسی بات کہہ گئے ہیں جس کی محققانہ تردید وہ خود اپنے علمی مقالات میں کر چکے ہیں۔ اس بنار پر اس کے فوراً بعد انھوں نے ایک اور مقالہ لکھا اور اس میں بتایا کہ

"مسلمانوں نے جتنی بت شکنیاں کیں مذہبی تعصب سے نہ تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مذہب اور پالیٹکس مخلوط تھے یعنی حریف کی ملکی طاقت کا مٹانا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی مذہبی طاقت کو بھی مغلوب کر دیا جائے آج ایسے روشن زمانہ میں لارڈ کچنر کو مہدی سوڈانی کی قبر اسی غرض سے اکھڑوا کر برباد کر دینی پڑی اور خود ہندوؤں نے اسی ضرورت سے اپنے زمانۂ اقتدار میں سینکڑوں مسجدیں برباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہادر راجپوتوں اور مہاراجوں نے نہ صرف جان و مال بلکہ اپنا ننگ و ناموس تک حوالہ کردیا۔ یعنی بیٹیاں تک دے دیں۔ یہ اکبر کا جبر اور راجپوتوں کا خوشامدانہ کام نہ تھا جبر اور خوشامد دل کی رگوں میں گھر نہیں کر سکتے"

اس کے بعد ایک مورخ کی حیثیت سے بتایا ہے کہ مغل سلاطین کے عہد میں ہندو مسلمانوں کی لڑائیاں مذہب کی وجہ سے ہرگز نہیں تھیں بلکہ کسی سیاسی معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے تھیں مثلاً عالمگیر کے مقابلہ میں اگر ہندو تلوارے کر بڑھے تو اس لئے نہیں کہ وہ مسلمان تھا بلکہ اس لئے کہ وہ شاہجہاں کی مرضی کے خلاف دارا شکوہ کا باغی تھا۔ اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

"اکبر کے دربار کے ستون اعظم بیرم خاں۔ خان اعظم کوکلتاش۔ بہادر خاں معو بیدار تھے۔ ان میں کس کا دامن بغاوت کے داغ سے پاک ہے؟ لیکن یہ بدنامی کسی ہندو راجہ نے نہیں اٹھائی"

اکبر تو خیر اکبر تھا جس سے ہندویوں بھی محبت کرتے تھے اورنگ زیب عالمگیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عالمگیر دکن چلا گیا اور پچیس برس تک دہلی کا پایہ تخت خالی رہا اس سے بڑھکر راجپوت راجاؤں کے لئے کیا عمدہ موقع تھا کہ دہلی پر حملہ آور ہوتے یا کم از کم راجپوتانہ میں علم بغاوت بلند کرتے لیکن یہ پورا درجہ چھوڑے میں جو راجپوتی طاقت کا مرکز تھے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کردیں اسی بناء پر مسلمانوں نے حملہ کے وقت بتخانے گرائے لیکن امن و امان اور تسلط کے بعد کبھی کوئی بتخانہ نہیں گرایا گیا۔ اور جو بتخانے گرائے گئے ان کے خاص پولیٹیکل اسباب تھے۔

(مقالات شبلی ج ۸ ص ١٦٩)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھیر تک نہ پہونچی۔

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"یہ پرانی داستان تھی آج بھی دیہات اور قصبات میں چلے جاؤ تو ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں وہ اسی طرح مسلمانوں کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں جس طرح خود ان کے عزیز و اقارب شریک ہوتے ہیں"

خود اعتمادی | مولانا ہندو مسلم اتحاد کو ضروری جانتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ وہ اکثریت کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں اور ان کے لطف و کرم کے سہارے جئیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انصاف کا، انسانیت اور دیانت کا۔ حب وطن اور ملک کے فلاح و بہبود کے جذبہ کا یہی تقاضا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اخبار یا نمبر کے کسی مسلمان نامہ نگار نے لکھا کہ ترکی اور ایران کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کا غیر ملکی وقار کم ہو گیا ہے اس لئے اب ان کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیئے تو مولانا نے اس پر برہم ہو کر لکھا:۔

"ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی رہیگی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے وہ اسلام کا ننگ ہے۔ کیا ہم کو ہمسایوں کے دامن میں اس لئے پناہ لینی چاہیئے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا؟ کیا اگر ترکی اور ایران پرزور ہوتے تو ہمارے ہمسایہ کے مقابلہ میں مدد کر سکتے؟

اس بیان کا آخری فقرہ پڑھئے۔ اس میں کس طرح ان مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے جو ہندوستان میں رہتے ہوئے ٹرکی۔ ایران یا افغانستان کی طرف نگاہ رکھتے ہیں ایک طرف ترکوں کے ساتھ مولانا کی یہ محبت کہ وہ اپنی کھال کو ان کے جوتوں کے تسمہ کے لائق بھی نہیں سمجھتے اور دوسری جانب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملکی معاملات میں ان کی خالص ہندوستانیت، اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ایک صحیح الخیال اور سلیم الفکر مسلمان اسلامی اخوت وبرادری کے عالمگیر رشتہ کے ساتھ ملکی معاملات میں کس طرح ایک محب ہندوستانی ہوتا ہے۔ قارئین کو شاید یاد ہو مولانا محمد علی مرحوم نے بھی گول میز کانفرنس میں ایک موقع پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا "جب اسلام کا معاملہ آئیگا تو میں اول و آخر مسلمان ہوں لیکن ملکی معاملات میں میں صرف ہندوستانی ہوں"

اردو اور ہندو | اردو زبان کی نسبت مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے جو شکوہ تھا اس کے متعلق بھی مولانا کے الفاظ سننے کے قابل ہیں:-

"کہا جاتا ہے کہ ہندو ہماری قومی زبان اردو کو مٹا رہے ہیں۔ لیکن کیوں کر؟ کیا اس طریقہ سے کہ اردو زبان کے عمدہ سے عمدہ میگزین اور رسالے (ادیب اور زمانہ) ہندو نکال رہے ہیں اور اردو مصنفین کی قدر افزائی کرکے بہت سے انشاپردازان اردو تیار کررہے ہیں؟ کیا اس طریقہ سے کہ ممالک متحدہ کے قابل ہندو انشاپردازی میں مسلمان انشاپردازوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں؟ زمانہ کے اوراق الٹتے ہوئے بارہا میں نے ہندو مضمون نگاروں کو رشک کی نگاہ سے دیکھا ہے! کیا اس طریقہ سے کہ پولیٹیکل معلومات کے لحاظ سے اردو کا بہترین پرچہ "ہندوستانی" ہے جس کو ایک ہندو ایڈٹ کرتا ہے۔؟

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اردو پرستی کا کیا ثبوت دیا ہے؟ ممالک متحدہ میں اس کا کون سا علمی پرچہ ہے؟ ان کی انجمن اردو کس مرض کی دوا ہے؟ اردو مصنفین کی کیا قدر افزائی کی جارہی ہے؟

انگریزوں کی پہلی پاکستانی کوشش | ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے صوبۂ بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس صوبہ کے کچھ علاقے کاٹ کر آسام سے ملا دیئے گئے لارڈ کرزن کے لفظوں میں اس کا مقصد یہ تھا کہ "ایک اسلامی صوبہ بنا دیا جائے"، ہم اس کو انگریزوں کی پہلی پاکستانی کوشش کہتے ہیں جس کا اصل مقصد ہندو مسلمانوں میں تفرقہ کی ایک آہنی دیوار قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد جب ایجی ٹیشن سخت ہوا تو ۱۹۱۱ء میں اس کی منسوخی کا اعلان کر دیا گیا اس اعلان سے جہاں فرقہ پرور مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ قوم پرور مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی مولانا شبلی بھی اس خوشی میں شریک ہوتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اب اس طمانچہ سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر جائیگا چنانچہ تمام فرقہ وارانہ اور غلط لیگی خیالات کی پرزور تردید کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"ان تمام خیالات سے اگرچہ ہمارے فرضی رہبروں کا گروہ مخالف ہے لیکن مخالفت کا اب نفس واپسیں ہے۔ قوم تیس برس تک احمق بن چکی اب اس کے حال پر رحم کھانا چاہیئے اور قوم کو سمجھنے دینا چاہیئے کہ یہ پالیٹکل سوانگ حقیقت میں پالیٹکس نہیں ہے۔"

ہم کو اس کا احساس ہے کہ مولانا شبلی کے مذکورہ بالا اقتباسات طویل ہو گئے ہیں جو اگرچہ خود ان کی تحریروں کی نسبت سے بہت کم اور مختصر ہیں لیکن ہم نے اس طوالت کو اس لئے گوارا کیا ہے کہ مولانا کے یہ افکار تنہا ان کے افکار نہیں تھے بلکہ تمام علمائے ہند کے تھے فرق صرف یہ ہے کہ مولانا کے ہاتھ میں قلم تھا اور وہ بھی بہت پرزور و اثر انگیز، الندوہ اور مسلم گزٹ دونوں انھیں کے پرچے تھے پھر جدید تعلیم یافتہ گروہ سے بہ نسبت دوسرے علماء کے مولانا قریب بھی زیادہ تھے اس لئے ان کے افکار و اعمال دیکھتے تھے تو برہم ہو جاتے اور اپنی تحریروں میں ان پر تنقید کرتے تھے علاوہ بریں ایک بات یہ بھی تھی کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانگرس بھی اس وقت تک حقوق طلبی اور سلف گورنمنٹ (زیر سایہ گورنمنٹ) کے مطالبہ کی منزل سے آگے بڑھی نہیں تھی اور علمائے دیوبند کو اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ خاموشی کے ساتھ آنے والی جنگ آزادی کے لئے بہادر سپاہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیار کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔

دیوبند اور ندوہ | بعض حضرات دیوبند اور ندوہ کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستاربندی کے موقع پر جن علمائے کرام نے ندوۃ العلماء ایسے مدرسہ کی تجویز کا خاکہ تیار کیا تھا ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ و مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی بھی شامل تھے۔[1] جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں مولانا نانوتوی بھی علوم جدیدہ کی اہمیت کے قائل تھے اور مولانا شبلی بھی۔ اختلاف صرف اس میں تھا کہ علوم جدیدہ کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو یا علوم قدیمہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر۔ مولانا شبلی پہلی شق کے قائل تھے اور مولانا نانوتوی دوسری شق کے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض مذہبی مسائل میں بھی اختلاف تھا۔ ممکن ہے یہ اختلاف غلط فہمی پر مبنی ہو جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست اور حکومت سے مرعوب ہو کر ہندوؤں سے الگ رہنے کا تعلق ہے علمائے ندوہ اور علمائے دیوبند بلکہ ہندوستان کے تمام ہی ہر مشرب و مسلک کے علماء متحد اور ایک تھے چنانچہ ترک موالات کا فتویٰ پانسو علماء کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا

مولانا ابوالکلام آزاد | اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال والبلاغ اس شان اور اس انداز سے نکالا کہ ملک کے کونہ کونہ میں آگ لگ گئی مسلمانوں کی عروق مردہ میں جوش و ولولہ کا خون دوڑنے لگا۔ ان میں حکومت سے متصادم ہونے کی جرأت پیدا ہو گئی سیاسی معاملات میں ان کا نقطۂ نظر بالکل غیر فرقہ وارانہ ہو گیا ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھائی بھائی جیسے ہو گئے خدا کے فضل و کرم سے مولانا اب بھی بقید حیات ہیں اس لئے ان پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی ص ۳۰۴ و ۳۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے ۔ برادرانِ وطن اب تو معلوم نہیں ان کی نسبت کیا رائے رکھتے ہوں گے لیکن دنیا جانتی ہے کہ ماضی قریب میں کانگرس کی زندگی میں کتنے ایسے نازک مرحلے آئے جبکہ مولانا کی رہبری خضرِ راہ ثابت ہوئی ۔ اور جبکہ کانگرس نام تھا مولانا آزاد کا ۔ اور مولانا آزاد دستے کانگرس !

مجھے یاد ہے ذرا ذرا ۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں :

"یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکلکر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے ہیں ۔ قدیم تعلیم یافتگاں کا حصّہ اس میں نمایاں ہو گیا بلکہ انھوں نے ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا جن میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے ۔

مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے اور رسالہ جات موسوم بہ الہلال و البلاغ کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی روح پھونکی اور اس وقت سے نہایت استقلال اور استقامت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم ہیں ۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں اڈیشن ص ۴۸۲)

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ | ہر چند کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام کے زبان و قلم نے غفلت کدۂ ہند کے خس و خاشاک میں آگ لگا رکھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت "انڈین نیشنل کانگرس" کا قدم بھی حقوق طلبی کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا ۔ ٹھیک اسی زمانے میں دیوبند نامی قصبہ کے ایک گوشہ میں ایک عالم ربانی و عارف یزدانی تھا جو اپنے کام و دہن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا اور نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم ۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ روسو اور مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ گلیڈسٹون کے مجموعۂ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن واسپنسر کے افکار و نظریات سے اُس نے نہ تمدن جدید کی کسی دلکشی کا حظ اُٹھایا تھا اور نہ اس نے عشرت کدۂ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازۂ حیات قال اللہ قال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنت نبوی تھا۔ اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکام الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا وہ دیکھنے میں منحنی اور لاغر و نحیف تھا مگر سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ بہ ظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھلگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بیں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے بھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے درد و گداز اور جذب و سوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں میں اور جلوتوں میں رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اجالے میں کبھی جنگ بلقان و طرابلس کے واقعات پڑھکر خوننابہ فشانی کرتا تھا اور کبھی اپنے ملک و وطن کی زبوں حالی و درماندگی پر نوحہ کناں ہوتا تھا دیوبند کے آسمان پر جگمگانے والے ستاروں کو شاید اب بھی یاد ہو کہ اس زمانہ میں کتنی گرم و سرد راتیں تھیں جو اس پیر مرد نے یوں ہی اپنے بوریہ پر رنج و کرب کی کروٹیں بدلتے اور درد و الم کی پرسوز آہیں بھرتے گذار دیں۔ اس کی مادی زندگی کا اثاثہ

بوریا نیست کہ در کلبۂ احزاں داریم

سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن جس کی نگاہ میں جاہ و جلال محمدی نے گھر کر لیا ہو اور جو الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل کی عینک سے قدرت لم یزلی کی بے پناہی کا مشاہدہ کر چکا ہو اس کے نزدیک صولت سکندری و دبدبۂ کیخسروی کی بھی کیا حقیقت ہو سکتی تھی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیان طلبا اور اساتذہ کا اجتماع آپ کے مکان پر ہوتا تھا تو آپ کسی سے الہلال اور البلاغ بڑی پابندی سے خود سنتے اور دوسروں کو سنواتے ترکوں کی مظلومیت و بے کسی کا کوئی واقعہ سنتے تو رو پڑتے اور ان کی اولو العزمی و بہادری کا ذکر آتا تو جوش و خروش اور فرط انبساط کے باعث چہرہ تمتما اٹھتا اور آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں اسی روزانہ مجمع کے کسی مولوی صاحب نے ایک روز کہا کہ حضرت! الہلال و البلاغ میں تو تصاویر ہوتی ہیں آپ پھر بھی ان کو اس قدر محبوب رکھتے ہیں " حضرت کم سخن اور کم گو مگر نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے جواب میں یہ شعر پڑھکر خاموش ہو گئے ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

نیشنل کانگرس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی لیکن یہاں حضرت شیخ الہند اس حکومت کا تختہ الٹ دینے کا ہی نقشہ تیار کر رہے تھے اس کی کن بھن حکومت کو بھی پہنچ گئی اور لارڈ مسٹن دیوبند آئے۔ دار العلوم دیوبند کا معائنہ کیا اساتذہ اور طلبا سے ملاقاتیں کیں لیکن حضرت شیخ الہند نے غصہ اور رنج کے مارے اس روز گھر سے باہر قدم نہیں رکھا کیوں؟ اس لیئے نہیں کہ لارڈ مسٹن انگریز تھے اسلام میں اس طرح کی قومی عصبیت اور ملکی و نسلی تعصب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ صوبۂ متحدہ و اودھ کے یہی گورنر تھے جنھوں نے مسجد کانپور کے واقعۂ ہائلہ کے سلسلہ میں معصوم بچوں اور مردوں پر گولیاں چلا کر انکو شہید کیا تھا اور اس کے بعد لارڈ صاحب مسلمانوں کو اپنانے اور ان کے دلوں سے . . . .

. . . . غم و غصہ دور کرنے کے لئے علماء سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت شیخ الہند کا سیاسی پروگرام | حضرت شیخ الہند عالم اسلام اور خود اپنے ملک پر انگریزوں کی چیرہ دستیاں دیکھتے اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے تھے بظاہر ان کی حیثیت یہ تھی کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس اول تھے حدیث کا درس دیتے تھے لیکن جس نے مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کے ساتھ غایت قرب وتعلق کی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کے دل کی دھڑکن کو اپنے قلب میں سمیٹ لیا ہو وہ صرف مدرسی اور خانقاہ نشینی پر قناعت نہیں کرسکتا تھا آپ نے نہایت منظم اور باقاعدہ طریقہ پر ہندوستان سے انگریزی راج ختم کردینے کا پروگرام مرتب کیا۔ حسن اتفاق سے شاگردوں میں مولانا عبیداللہ سندھی۔ مولانا سید محمد انور شاہ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہم ایسے ارباب عزیمت واستقامت مل گئے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے استاذ کی علمی نیابت کی اور باقی حضرات نے حضرت کے سیاسی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

کابل میں کانگرس کا کام | حضرت شیخ الہند انڈین نیشنل کانگرس کے پروگرام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا یقین تھا کہ جب تک باہر کی طاقتوں میں سے کسی طاقت سے کام نہیں لیا جائے گا محض حقوق طلبی کی جنگ کے ذریعہ آزادی حاصل نہیں ہوسکتی اس بنا پر آپ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم دیا۔ یہ خاص مشن کیا تھا؟ اور مولانا نے کابل پہنچ کر کیا کیا؟ اس کا حال خود مولانا کی زبانی سنئے فرماتے ہیں

"۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ . . . . . . کابل جاکر مجھ کو معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے خادم کی شیخ الہند کو اشد ضرورت تھی اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جاؤں اسی وقت سے میں کانگرس کا داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ کے دور میں میں نے کانگرس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے گیا سیشن نے منظور کرلیا۔ یہ برٹش امپائر سے باہر پہلی کانگرس کمیٹی ہے اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں "

(خطبات مولانا عبید اللہ سندھی ص ۶۸-۶۹)

مولانا کا یہ بیان غور سے پڑھئے اس میں صاف مذکور ہے کہ مولانا حضرت شیخ الہند کے بھیجے ہوئے کسی خالص اسلامی یا صرف مسلمانان ہند کے لئے کسی کام کی غرض سے کابل نہیں گئے بلکہ وہ کام تھا ہندوستانی۔ یعنی ایک ملکی اور وطنی کام تھا جس کا فائدہ ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا۔ کیونکہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور یہ کشتی کسی دست غیب کی مدد سے غلامی کے بھنور سے نکل کر آزادی کے ساحل سے ہم کنار ہوتی تو دونوں ہی اس سے شاد کام ہوتے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مولانا شروع شروع میں یہ ہندوستانی کام "اتحاد اسلام" کی بنیاد پر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جن بیرونی طاقتوں سے وہ اس معاملہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدد لینا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی ٹرکی اور افغانستان وہ اسلامی طاقتیں
اور ایک غیر افغانی اور غیر ترکی مسلمان کی آواز ان کے لئے اسی وقت قابل شنوائی و پذیرائی
سکتی تھی جبکہ ان کے جذبات کو اسلامی اخوت و اتحاد کے عنوان سے ابھارا جاتا لیکن کابل پہنچنے
ایک سال بعد ہی مولانا کو یہ صاف محسوس ہوگیا کہ آم کے درخت سے جامن کی امید نہیں کی
سکتی سوال جب صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا اور سب ہندوستانیوں کا ہے
س کو ایک خالص مذہبی رنگ میں کیوں کر چلایا جا سکتا ہے اس بنا پر امیر حبیب اللہ خاں
یسے شخص نے بھی مولانا کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگرس کے نام سے کام کرنے کا مشورہ
ور مولانا نے فوراً اپنے کام کا نہج اور طریق بھی بدل دیا ۔

ستا شیخ الہند کا اصل مقصد | مولانا سندھی جس کو ہندوستانی کام کہتے ہیں اب خود اپنوں کی نہیں
غیروں کی بھی ۔ یعنی ان کی جو ہمیشہ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے
دت سن لیجئے کہ وہ ہندوستانی کام کیا تھا ، رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں حضرت شیخ الہند کی
یک کا ذکر کرتے ہوئے درج ہے ۔

" اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کا ایک شاگرد مولوی عبیداللہ
کابل چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے جرمنی اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا
تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا اسی سال ستمبر میں مولوی محمود حسن
مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں سے انھوں نے غالب پاشا کا دستخطی اعلان مولوی محمد میاں
کے ہاتھ مولوی عبیداللہ کے پاس کابل بھیجا جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب
ی گئی تھی ۔ ان اصحاب نے یہ طے کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد ہندوستان
میں ایک عارضی حکومت (Interim Govt:) قائم کی جائے جس کے پریسیڈنٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راجہ مہندر پرتاب سنگھ ہوں جو ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے ۔ اور ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلقات رکھتے تھے ؛"

(رپورٹ رولٹ کمیٹی اردو صفحات ۲۵۳ ۔ ۲۵۴)

رپورٹ کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد ملک کے مشہور فاضل مولانا سید طفیل احمد منگلوری بجا طور پر لکھتے ہیں ۔

"اس سے یہ واضح ہو گیا کہ برطانیہ کے خلاف مولوی محمود حسن کی تحریک مذہبی نہ تھی بلکہ سیاسی تھی اس لئے کہ انھوں نے اپنی مجوزہ حکومت کا صدر ایک ہندو کو قرار دیا تھا پس مسلمانوں کی بابت یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہبی مجنون ہیں اور انگریزوں یا ہندوؤں سے مذہبی تعصب رکھتے ہیں اور اسلامی حکومتوں سے تعلقات رکھ کر اُن کے ذریعہ ہندوستان میں کوئی مذہبی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولوی صاحب موصوف کی تحریک کا منشا ہندوستان میں بلا امتیاز مذہب و ملت خالص ہندوستانیوں کی حکومت قائم کرنا تھا

(مسلمانوں کا روشن مستقبل پانچواں اڈیشن ص ۳۸۶)

حضرت شیخ الہند کے جذبہ ۔ طرز فکر اور سیاسی رجحان طبع پر اس واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ سیوہارہ ضلع بجنور میں ایک بزرگ ہیں جو فتوی پوچھے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے انھوں نے ایک مرتبہ خط کے ذریعہ حضرت شیخ الہند سے دریافت کیا کہ گاندھی کیپ اوڑھنا مذہباً کیسا ہے ؟ آپ نے جواب لکھ کر بھیجا وہ مستفتی کے پاس اب بھی محفوظ ہے ۔ فرماتے ہیں کہ گاندھی ٹوپی چونکہ ایک ایسی جماعت کا شعار ہے جو حریت طلب اور انگریزی حکومت کی شدید مخالف اور اسی وجہ سے انگریز بھی اس کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے اس بنا پر بندہ کے نزدیک گاندھی ٹوپی کا استعمال نہ صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بر کہ مسلمانوں کے لئے جائز ہے بلکہ باعث ثواب اور مستحسن ہے"

تحریک شیخ الہند کی عظمت اور گیرائی | علاوہ بریں مسلمانان ہند کے لئے یہ امر بھی کچھ کم قابل فخر نہیں ہے کہ عصر حاضر کی سب سے بڑی تحریک سوشلزم و کمیونزم کے نفس ناطقہ "سوویٹ روس" سے انڈین نیشنل کانگرس کا سب سے پہلے جس شخص نے تعارف کرایا وہ مسلمان ہی تھا یعنی مولانا عبید اللہ سندھی۔ مولانا خود اپنی روئداد حیات قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینے ماسکو میں رہا سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگرس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں"

" میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگرس۔ دوم اپنے ہندوستانی رفقاجن میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی سوشلسٹ اور نیشنلسٹ بھی۔ سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون ہوں اور شکر گذار رہوں گا اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصیص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا"

(خطبات مولانا عبید اللہ سندھی ص ۶۹)

ڈاکٹر مونجے۔ بھائی پرمانند اور مسٹر ساورکر ایسے کتنے سیاسی کارکن ہیں جو جلا وطنی کی مدت گذارنے کے بعد ہندوستان واپس آ کے تو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئے لیکن حضرت شیخ الہند کے فیض صحبت کا یہ اثر ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی پچیس سال تک ہندوستان سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہیں شدید سے شدید قسم کے مصائب اور آلام سے دو چار ہوتے ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ حضرت شیخ الہند کے جس مشن (یعنی ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پردہ گئے تھے ایک لمحہ کے لئے اس سے غافل نہیں ہوتے اور یہ سارا زمانہ اسی مقصد عظیم کے لئے ادھیڑ بن میں گذار دیتے ہیں ۱۹۳۶ء میں وہ واپس آ ئے تو انھیں انکار کوئے کر آتے۔ حالانکہ یہ زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست کے شباب کا تھا۔ اپنے ایک خطبہ میں کس صفائی سے فرماتے ہیں:۔

"ہمارے پروگرام کا سب سے اہم جزیہ ہے کہ ہم سیاسیات ہند میں اپنا حصہ اپنے قبضہ میں لانا چاہتے ہیں اور ابھی سے اس کی تیاری کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں ہمیں بیرونی مسلمانوں کی کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ آور ہو تو خواہ وہ مسلمان کیوں نہ ہو ہم اس کا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان طاقت کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ ہماری موجودگی میں وہ اسلام کے نام پر ہندوستان کی سرزمین کو پامال کرنے کی کوشش کرے کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہمیں اپنے وطن میں حکومت قایم کرنے کا حق نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بیرونی مسلم ممالک کو اپنی حکومتوں کو مستحکم اور منظم کرنے کا حق حاصل ہے مگر ہم ان کے اس حق کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرکے اسے فتح کرنے کی کوشش کریں یہ ہمارا حق ہے کہ ہم ہندوستان میں ہندوستانی حکومت قایم کریں!!

(خطبات ص ۱۹۶)

جن لیڈروں نے مسلمانوں کی توجہ کو مسلم ممالک کی طرف منعطف کرکے انھیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ملکی مسائل و معاملات پر غور کرنے سے باز رکھا ہے ان کی شدید مذمت اس طرح کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مسلمانانِ ہند کی توجہ ہمیشہ اجنبی امداد کی طرف مصروف رہی یا مصروف رکھی گئی انھیں اپنے فیصلہ سے اپنے ملک میں اپنی حکومت پیدا کرنے کے خیال کی طرف نہ لایا گیا ہے اور نہ آنے دیا گیا ہے جن لوگوں نے اس غلط روی میں حصہ لیا انھیں پہلے دور میں تو قابل معافی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس بیداری کے زمانہ میں جب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ کسی بیرونی مدد پر بھروسہ کرنا ہمارے لیے زہر قاتل ہے کسی ایسے شخص کو معاف نہیں کیا جائیگا جو آج بھی اس وہم باطل میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرے ہے"

(خطبات ص ۱۹۸)

امام الہام علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ | مولانا عبیداللہ سندھی تو خیر بھر بھی سیاسی تھے اور ان کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں بسر ہوئی تھی حضرت شیخ الہند کے دوسرے تلمیذ خاص اور تربیت یافتہ اور صحیح علی جانشین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری کے افکار سیاسی کو ملاحظہ فرمائیے تو یہاں بھی آپ کو وہی چیز ملیگی بظاہر ہے کہ حضرت الاستاذ سراپا علم و فضل تھے۔ آپ کا مشغلہ کتب بینی۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے سوا کچھ اور نہ تھا اور اسی وجہ سے آپ موجودہ سیاست کی زبان میں گفتگو کرنے سے بھی آشنا نہ تھے۔ جو بات دل میں ہوتی اسے برملا اور صاف صاف کہتے تھے حضرت الاستاذ نے جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء میں صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا ہم ذیل میں اس خطبہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ انگریز جس جماعت کو مذہبی دیوانے (Fanatics) سمجھ کر ہمیشہ اپنے لیے سخت خطرناک سمجھتی رہی اس جماعت کا وطن دوستی اور برادران وطن کے ساتھ صلح و دوستی کے تعلقات رکھنے کے باب میں کس قدر صاف واضح اور روشن رویہ تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاہ صاحب

لہ مولانا سندھی کے افکار سیاسی پر ہم اس مضمون میں آگے چلکر مستقلاً گفتگو کریں گے۔ اسلئے یہاں اسی قدر لکھنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے جس زمانہ میں خطبہ پڑھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو مسلم فسادات مسلسل پانچ چھ برس سے ہو رہے تھے اور مسلمان عام طور پر کانگرس کی رجعت پسندانہ ذہنیت سے تنگ آ کر اس سے یک گونہ بیزاری محسوس کرنے لگے تھے تاہم ملاحظہ کیجئے حضرت شاہ صاحب کا خطبہ کس درجہ عالی حوصلگی اور بلند ہمتی و حریت طلبی کے جذبات کا آئینہ دار ہے"

<u>مسلمان اور وطن دوستی</u> وطن دوستی کی نسبت ارشاد ہے

"ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گذر گئیں ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں جو زبان حال سے ان کے علم و ہنر پسندی اور حب وطن کی شہادت دے رہے ہیں موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کی آب و گل سے ہے۔ ان کو ہندوستان کی سرزمین سے ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک محب وطن کو ہونی چاہئے اور کیوں نہ ہو؟ جبکہ ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن کے باب میں اسوہ موجود ہو...

....آپ نے اپنے وطن مکہ معظمہ کو خطاب کر کے فرمایا" خدا کی قسم: خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے لیے جو دعا کی تھی اس کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبۂ حب وطن سے خالی ہو سیں یقین رکھئے کہ مسلمانوں کے قلوب میں ہندوستان کے ساتھ پوری محبت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی رہتی ہیں اور ہندوستان ان کا بھی وطن ہے اس لیے طبعی طور پر ان کو بھی ہندوستان کے ساتھ محبت ہونی چاہئے اس لئے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے" (ص ۱۹ - ۲۰)

مسلمانوں پر بیرونی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت کا فرض | مسلمانوں پر بھی بیرونی حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت کا فرض ایسا ہی عائد ہوتا ہے جیسا کہ ہندوؤں پر اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اگر آج مسلمانوں کو اکثریت کی تعدی کے خطرہ سے محفوظ کردیا جائے تو وہ ہندوستان کی طرف سے ایسی ہی مدافعانہ طاقت ثابت ہوں گے جس طرح اپنے وطن سے کوئی مدافعت کرتا ہے

یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کردیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا نہایت پست خیالی ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہونگے اور ہمسایوں کی زیادتیوں کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو" (ص ۲۱)

ایک نہایت اہم نکتہ | اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب نے ایک نہایت اہم امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ معاہدہ ہو اور اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں کے مذہبی حقوق محفوظ ہوں اور وہ اپنی ملکی حکومت میں اپنا حصہ بھی رکھتے ہوں تو اب نہ صرف یہ کہ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف۔ خواہ وہ مسلمان ہی ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہ میں اپنی جان تک کی قربانی گوارا کرے وہ جس ملک میں بھی ہو اس ملک کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے صحابۂ کرام مکہ سے ہجرت کرکے حبش جاتے ہیں۔ وہاں ایک دشمن کا لشکر ملک پر حملہ آور ہوتا ہے۔ صحابہ حبش کے بادشاہ نجاشی کے سامنے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور ملک کی حفاظت میں حبشیوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔"

(خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۶ء ص ۷۴)

دارالاسلام یا دارالامان حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ الکشمیری نے اس خطبہ میں بحیثیت ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ کے ایک اور اہم بحث بھی اٹھائی ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی حیثیت انگریزوں کے دورِ حکومت میں کیا ہے؟ اور آزاد ہونے کے بعد اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ وہ دارالاسلام ہوگا یا کیا؟ اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ نے بڑی نکتہ آفرینی اور ژرف نگاہی سے کام لیا ہے

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ملک کی دو ہی قسمیں ہیں دارالاسلام یا دارالحرب۔ پھر دارالاسلام کی تعریف میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کے نزدیک دارالاسلام اس ملک کو کہتے ہیں جہاں اسلامی دستور نافذ ہو۔ حدود اللہ قائم ہوں اور تمام معاملات و خصومات کا فیصلہ اسلامی احکام کی روشنی میں کیا جاتا ہو۔ اس تعریف کے پیش نظر وہ ممالک بھی دارالاسلام نہیں کہلائے جا سکتے جہاں آبادی میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہو اور جہاں کی حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے ہی قبضہ میں ہو لیکن اس کے باوجود حدود اللہ کا وہاں نفاذ نہ ہو۔ زانی اور شراب خوار کے کوڑے نہ لگائے جاتے ہوں۔ رنڈیوں کے چکلہ میں لوگ بے دھڑک آتے جاتے ہوں۔ شراب کی دوکانوں پر کوئی بندش نہ ہو۔ سودی کاروبار پر روک ٹوک نہ ہو رمضان کے مہینہ میں کھلے بندوں کھانے پینے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی قانوناً ممانعت نہ ہو اسلامی شعائر کی پردہ دری کرنیوالوں سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی ہو عورتیں تبرج جاہلیت کے ساتھ نسوانی حسن کی ایک ایک ادا کو نمایاں کرتی پھریں اور ملک کا مروجہ قانون ان کا دامن پکڑنے سے عاجز ہو۔

دوسری تعریف دارالاسلام کی یہ ہے کہ مسلمان احکام اسلام بجالانے میں آزاد ہوں اور ان کی جان و مال مکمل طور پر محفوظ ہو اس تعریف کی رو سے وہ ممالک بھی دارالاسلام بن جاتے ہیں جہاں غیر مسلموں کی کوئی آئینی حکومت قائم ہو مگر اس کے آئین و دستور کے اعتبار سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو اور ان کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہو۔

اب اگر ملک کو انھیں دو قسموں یعنی دارالاسلام اور دارالحرب میں محدود کر دیا جائے تو یہ دونوں تعریفیں رداً و عکساً صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ کیونکہ مثلاً پہلی تعریف کے پیش نظر مسلمانوں کا وہ ملک جہاں اسلامی قانون نافذ نہیں ہے وہ جب دارالاسلام نہیں ہوا تو دارالحرب ہوا اور ایک مسلمان کے لئے دارالحرب کا حکم یہ ہے کہ یا تو جنگ کرے یا وہاں سے ہجرت کر جائے اسی طرح دوسری تعریف پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ جب جو ملک غیر مسلم حکومت کے زیر نگیں ہو اور مسلمان وہاں مذہبی معاملات میں آزاد ہوں دارالاسلام ہوا تو یہاں کے عقود فاسدہ سب کے سب ناجائز ہونے چاہئیں حالانکہ ایسا ہونا سخت دقت طلب اور دشواری کا باعث ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب اس پیچیدگی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں کہ ملک فقط دو قسم کے نہیں ہوتے بلکہ تین طرح کے ہوتے ہیں ایک دارالاسلام دوسرا دارالامان اور تیسرا دارالحرب۔ ہندوستان زیر حکومت برطانیہ کے متعلق آپ کا رجحان یہ ہے کہ وہ دارالحرب ہے چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے فتوئے کا حوالہ دینے کے بعد یہاں کے حالات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا تذکرہ کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں " تو آج تو اس کا دارالاسلام نہ ہونا اس سے زیادہ واضح اور روشن ہے " اور اسی بنا پر وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ دونوں متحد اور متفق ہو کر اپنے وطن کو آزاد کرنے کی سعی کریں مگر چونکہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کو مطلقاً دارالحرب نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لئے فرماتے ہیں " ہندوستان کو اس کی موجودہ حالت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے " یہ زیادہ سے زیادہ" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت الاستاذ کا اصل رجحان کیا ہے اچھا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو پھر اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کے جواب میں آپ نے اس معاہدہ کی چند اہم اور ضروری دفعات نقل کی ہیں جو کہ سے ہجرت کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے یہود میں ہوا تھا۔ ان دفعات میں سے بعض نہایت اہم دفعات جن کا تعلق ہمارے موضوع بحث سے ہے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں

(۱) یہ تمام معاہد جماعتیں (یعنی قریش۔ مہاجرین۔ انصار۔ یہودیوں کے مختلف قبائل) دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم شمار ہوگی۔

(۲) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ و فساد برپا کرتا اور مخلوق سے ظلماً تاوان وصول کرتا اور خلق خدا کو ستاتا ہو۔ تمام مسلمانوں کو متفق ہو کر اس شخص کے خلاف کام کرنا لازم ہوگا اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) جن یہودیوں نے ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ انکی مدد اور ان کے ساتھ ہمدردی و غمگساری کا برتاؤ کریں۔ انپر کسی قسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ اُن کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔

(۴) مسلمانوں کو پابندی عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارم اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔

(۵) جن مسلمانوں نے اس معاہدہ کو مان کر اس کی پابندی کا اقرار کر لیا ہے اور وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کے دفعات میں تغیر یا کوئی نئی بات پیدا کریں اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاملہ رکھیں جو عہدنامہ ہذا کا احترام نہ کرتا ہو۔

(۶) یہود بنو عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے علاوہ باقی سب امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی دوسری جماعتوں کے نام لے کر مثلاً یہود بنی النجار۔ بنی الحارث۔ بنو ساعدہ۔ بنو جشم۔ اور یہود بنی الاوس کے متعلق بھی تصریح فرمادی ہے کہ ان تمام یہودی قبائل نے بھی چونکہ معاہدہ کر لیا ہے اس لئے یہود بن عوف کی طرح ان کے بھی حقوق ہوں گے۔

حضرت الاستاذ نے دراصل مندرجہ بالا اور دوسری دفعات کو نقل کر کے یہ بتانا چاہا کہ

(۱) ہندو اور مسلمان دونوں معاہدہ کر لیں گے تو جس طرح مسلمان اور یہود بنی عوف دوسروں کے بالمقابل ایک جماعت اور ایک قوم تھے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمان بھی دوسروں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم ہوں گے۔

(۲) ہندوؤں پر مسلمان خود ظلم کریں گے اور نہ کسی اور کو ان پر ظلم کرنے دیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) مسلمان ہرگز کسی ایسے شخص سے کوئی واسطہ اور کوئی سروکار نہ رکھینگے جو ان کے اور ہندوؤں کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرے یا اس کو توڑے

بحث کے خاتمہ پر حضرت الاستاذ فرماتے ہیں

"میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالاسلام یا دارالحرب کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہموطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں"

اس کے بعد ارشاد ہے

"جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں ہی دونوں قوموں کو رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے اور دونوں کا وطن یہی ہے۔ اس لئے ہر فرد ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے جس سے یہ روز کا جدال وقتال دور ہو۔ اور ہر شخص امن و اطمینان کی زندگی بسر کر سکے"

اس بحث کو اس طرح ختم کر دینے سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں ایک معاہدہ کے پابند ہو کر رہیں تو حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اس حالت میں ہندوستان دارالحرب تو یقیناً نہیں ہو گا! لیکن کیا دارالاسلام ہو گا؟ تو شاہ صاحب کا میلان ادھر بھی نہیں نظر آتا ہے۔ بلکہ دارالامان ہوگا اور از روئے معاہدہ مسلمانوں پر اس ملک کی جو خود ان کا بھی وطن ہے خیر خواہی اور اس کی حفاظت و مدافعت ایسی ہی واجب اور ضروری ہو گی جیسی کہ ہندوؤں پر ہے۔ چاہے وہ حملہ آور کوئی بیرونی مسلم طاقت ہی ہو اور یہ سب کچھ محض ڈپلومیسی نہیں بلکہ از روئے شرع و احکام دین مسلمانوں کو کرنا ہوگا! (باقی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات

(از جناب خواجہ احمدؐ فاروقی صاحب ایم۔ اے لکچرر دہلی کالج ، دہلی)

ہندی کلچر کا ایوان رفیع جس مضبوط بنیاد پر قایم ہے وہ فکر و خیال کی ایسی مفاہمانہ روش ہے جس نے اس کلچر میں ایک خاص قسم کی وسعت ، وسعت ، گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے یہاں بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں ، بہت سے سیاسی انقلابات رونما ہوئے ، بہت سے حملہ آور فاتحانہ پرچم کے ساتھ داخل ہوئے لیکن ان موجوں نے تہذیب اور تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز کر دیا۔ اور اس ملک کے دامن کو گلہائے رنگارنگ سے معمور کر دیا۔ اتحاد و امتزاج کا یہ سرچشمہ جو موہنجداڑو سے بھی پہلے پھوٹا تھا۔ عہد قدیم اور عہد وسطی کے میدانوں سے گزرتا ہوا آج بھی اسی طرح جاری ہے ، برطانوی دور میں اس کی رفتار سست ضرور ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی ۔

پچھلے دس برس میں جبکہ برطانوی سامراج ، ملک کی ترقی پسند قوتوں سے آخری لڑائی لڑ رہا تھا ، فرقہ وارانہ اختلافات اس درجہ بڑھ گئے کہ آج اتحاد و اتفاق کی ہر گفتگو اگر بے معنی نہیں تو حیرت انگیز ضرور نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شگاف تا دامن ایماں پہنچ چکا ہے اور کوئی صورت رفو اور چارہ سازی کی نہیں ہے لیکن جو لوگ تاریخ کے اشاروں کو سمجھتے ہیں اور ماضی و مستقبل کے باہمی ربط کو پہچانتے ہیں وہ ان ہنگامی مناقشات سے مایوس نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اتحاد پسندی کے اس رجحان کے ساتھ ایک ہزار سال کی تاریخ والبستہ ہے اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں اور اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ کوئی آندھی کوئی طوفان اس درخت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ شاہد ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ابتدا ہی سے اتحاد و یگانگت رہی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اس اتحاد کا پرتو نظر نہ آتا ہو۔ سر پی سی اے نے تو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں یہاں تک لکھا ہے کہ انیسویں صدی سے قبل فرقہ وارانہ مسئلہ کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس اختلاط باہمی کی گواہ ہماری مصوری، ہماری موسیقی، ہماری شاعری، ہماری عمارتیں اور ہماری مذہبی تحریکیں ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تخلیقی کوششیں ہمیشہ زمان و مکاں کے قومی موثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز جس نے نئے حملہ آوروں اور قدیم ہندیوں میں یکجہتی کا ماحول پیدا کیا وہ بھگتی کی تحریک ہے۔ اس مذہبی بیداری نے جو ہندو مذہب اور اسلام کے باہمی عمل اور رد عمل سے پیدا ہوئی تھی ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ چیتن کے ماننے والوں میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی تھے۔ اجمیر کے حسینی پنڈت آج تک موجود ہیں۔ سنگایت فرقہ کے تمام تر عقاید اسلام سے مستعار ہیں۔ راما نند، کبیر، نانک اور تکارام۔ اسلام اور ہندو دھرم کی روحانی بنیاد کو ایک سمجھتے تھے۔ شیخ اسماعیل لاہوری کی مجالس وعظ میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو شریک ہوتے تھے۔ حد یہ ہے کہ تصوف و معرفت کے مسائل میں جو اصطلاحات ابتداءً استعمال ہوئیں وہ وہی تھیں جو ہندو سنت اور بھگت استعمال کرتے تھے[2]۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ حد بندیاں ٹوٹ رہی تھیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔

معرفت کے اس نئے راگ نے ہندو اور مسلمان دونوں کو مسخر کر لیا تھا۔ مسلمان صوفیا کے یہاں بھی یہی رواداری یہی ایک دوسرے کو سمجھنے اور متاثر کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء اپنی خانقاہ کی چھت پر کھڑے تھے۔

۱؎ پنجاب میں اردو، محمود شیرانی ۲؎ ملاحظہ ہو معراج العاشقین (حضرت گیسو دراز رح)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیچے دیکھا کہ کچھ ہندو اپنے خاص قاعدہ سے بتوں کی پوجا کر رہے ہیں آپ نے اس کے اوپر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ یہ مصرع پڑھا ؎ ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے حضرت امیر خسروؒ قریب موجود تھے، انھوں نے برجستہ فرمایا :

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

یہی دراصل وہ بنیاد تھی جس پر عہد وسطیٰ میں مذہبی مفاہمت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اختلافات کی سطح کے نیچے جو ذہنیت کارفرما تھی وہ اختلافات پر متحد ہو جانے کی تھی ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف کی آمیزش نے ایسی خوشگوار فضا پیدا کردی تھی کہ اسلام، ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف قسم کے فلسفوں اور خیالوں کو برداشت کیا جارہا تھا وہاں وہ بھی ایک نظام فکر کو پیش کر رہا تھا۔ اور جہاں بہت سے طبقے اور گروہ تھے وہاں ایک طبقہ مسلمانوں کا بھی تھا۔ دنیا کی تاریخ کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہندوستان کا یہ دور مذہبی رواداری کے اعتبار سے سب سے زیادہ تابناک نظر آئے گا۔

یہ ہی رنگ معاشرت کے آئینے میں بھی نظر آتا ہے۔ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کی معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔

سلاطین دہلی کے زمانہ میں اتحاد کے یہ رشتے اور مضبوط ہو گئے بابر اس "ہندوستانی طرز زندگی"[1] کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا تھا یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ تیمور کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی ملازمتوں میں ہندو مسلمان کا فرق آگے چل کر اتنا کم ہوگیا تھا کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی

---

[1] تزک بابری (بیورج)

© rasailojaraid.com